بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

’قراردادِ مقاصد‘: دستور سازی اور اعتراضات کا جائزہ

پروفیسر خورشید احمد

’قراردادِ مقاصد‘ کے پس منظر، مفہوم اور مقصود، اس کے متعین کردہ اصولِ حکمرانی اور اس کی تاریخی، سیاسی اور قانونی حیثیت کے چند اہم پہلوؤں کی وضاحت کے بعد، ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ چند گزارشات اس حوالے سے بھی کریں کہ ’قراردادِ مقاصد‘ ایک ایسا دستوری فرمان (constitutional declaration) ہے، جس کے پیچھے پوری پاکستانی قوم ہے اور جو ۱۹۴۹ء کے بعد سے ہر دستوری دستاویز یا دستور کا حصہ رہی ہے۔ سیکولر طبقوں نے جب بھی ’قراردادِ مقاصد‘ کو ہدف بنانے کی کوئی کوشش کی، ان کو منہ کی کھانی پڑی۔ اس کے پیچھے جو قومی اجماع (National Consensus) کی قوت ہے، وہ اسے ہر دوسری دستاویز پر فوقیت دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نہ صرف دستور کا دیباچہ ہے بلکہ دستور کے قابلِ نفاذ (operational) حصے میں شامل ہے اور اس میں یہ واضح ہدایت موجود ہے کہ اس قرارداد کا عملاً اطلاق ہر معاملے پر ہوگا۔

دستور کی دفعہ ۲-اے کے یہ الفاظ بڑے اہم اور فیصلہ کن ہیں کہ:

> اسے یہاں دستور کا لازمی حصہ (substantive part) بنایا جاتا ہے اور اس کے مطابق فوری مؤثر ہوگا۔

یعنی ’قراردادِ مقاصد‘ میں بیان کردہ اور طے شدہ اصول اور احکام کو دستور کا مستقل حصہ قرار دیا گیا ہے اور وہ اپنی ہیئت اور روح کے مطابق مؤثر ہوں گے۔

یہ تصریح ’قراردادِ مقاصد‘ کے اصول و احکام کو اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور سے

اس طرح منسلک اور متعلق کر رہی ہے کہ اب دستور کو 'قراردادِ مقاصد' کے اصول و احکام کی روشنی ہی میں سمجھا اور نافذ کیا جائے گا۔ اس ضمن میں اگر کہیں کوئی اشکال ہو، تو اس کو مناسب دستوری طریقے سے رفع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

'قراردادِ مقاصد' کا خصوصی استحقاق

یہاں اس تاریخی پس منظر کی بھی نشان دہی مفید ہوگی کہ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کے عشروں میں جب ملک میں دستور نافذ کیا گیا اور جب دستور منسوخ یا معطل تھا، ہر دونوں اَدوار میں 'قراردادِ مقاصد' کو قوم اور پارلیمنٹ ہی نہیں بلکہ عدالتوں نے بھی ایک محکم دستوری فرمان کی حیثیت سے تسلیم کیا اور اسے ریاست اور حکمرانی کے تمام آداب کے باب میں ایک Grundnorm (باشکوہ ماخذِ قانون) قرار دیا۔ البتہ ۱۹۷۳ء میں سپریم کورٹ کے ایک فیصلے ضیاء الرحمٰن کیس (*PLD, 1973, Sc.49*) میں، تب چیف جسٹس جناب جسٹس حمودالرحمٰن نے واضح طور پر اس امر کا اظہار کیا تھا کہ اس قرارداد کی مکمل بالادستی کے لیے اس کو دستور کا صرف دیباچہ نہیں، اس کا اطلاقی حصہ ہونا چاہیے۔

اس خلا کو پُر کرنے کے لیے 'قراردادِ مقاصد' کو دیباچے کے علاوہ دستور کی دفعہ ۲-اے کی شکل میں دستور میں شامل کیا گیا۔ اس قرارداد کا متن ۱۹۴۹ء میں منظور کیا گیا اور اس صراحت کے ساتھ منظور کیا گیا کہ اللہ کی حاکمیت کے قیام اور حدوداللہ کی پاس داری کے لیے جو اختیار ریاست کو امانتاً دیا گیا ہے وہ اسے عوام کے نمایندوں کے ذریعے استعمال کرے گی۔ واضح رہے کہ دستور کے دیباچے میں 'ریاست' کی جگہ 'عوام' کا ذکر کیا گیا ہے، مگر دفعہ ۲-اے میں جس 'قراردادِ مقاصد' کا ذکر ہے اور جو دستور کے متن میں شامل ہے، اس میں ریاست ہی کو یہ اختیار تفویض کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ 'قراردادِ مقاصد' کا ہدف عوام کو اختیار دینا نہ تھا بلکہ قیامِ پاکستان کی شکل میں جو ریاست وجود میں آئی تھی، اسے مشرف بہ اسلام کرنا، اور اس کے لیے دستور ساز اسمبلی کو جو دستور دینا تھا، اس کی نوعیت، مقصد اور حدود کا تعین کرنا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ 'قراردادِ مقاصد' کے اسمبلی سے پیش ہونے کے بعد پہلی ترمیم جو کانگریس کے ہندو ارکان نے پیش کی، وہ یہی تھی کہ 'ریاست' کی جگہ 'عوام' کا لفظ استعمال کیا جائے۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے انھوں نے صاف لفظوں میں کہا کہ ان کا مقصد 'عوام کی حاکمیت' کے سیکولر

جمہوری اصول کو قرارداد میں لانا ہے، تاکہ اللہ کی حاکمیت کے اس اصول پر کہ عوام کے منتخب نمایندوں کو حدود اللہ کے اندر حکمرانی کے اختیارات کو استعمال کرنا ہے، تبدیل کردیا جائے۔ مقصد یہ تھا کہ کانگریس نے متحدہ ہندستان میں جو تصورِ حکمرانی پیش کیا تھا، وہی چور دروازے سے پاکستان پر بھی مسلط کیا جاسکے۔ ایشو صرف 'ریاست' کا لفظ نہیں تھا بلکہ مذہب اور سیاست کی جدائی کے اس تصور کو نئے لفظوں کا لبادہ پہنا کر پاکستان کی منزل کھوٹا کرنا تھا۔ ان ترامیم کی تائید میں کانگریس کے ہندو ارکان کی تقاریر اور تحریکِ پاکستان کے سرکردہ قائدین کا ان کے جواب میں موقف، مسئلے کی نوعیت کو سمجھنے میں مددگار ہوگا۔

سریش چندرا چٹوپادھیا نے ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو ترمیم کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا:

> میرے خیال میں قرارداد کا یہ حصہ حذف ہونا چاہیے۔ میری راے میں تمام اختیارات 'جمہور' کو حاصل ہیں اور وہ مملکت کی وساطت سے اپنے اختیارات کا استعمال کرتے ہیں، مملکت تو محض ان کی ترجمان ہے۔ قرارداد کی رُو سے اللہ تبارک وتعالیٰ جمہور کی وساطت سے اختیارِ حکمرانی مملکت کو عطا کرتا ہے اور جمہور محض مملکت کا آلۂ کار بن جاتے ہیں۔ جمہور کو کوئی اختیار یا اقتدار نہیں رہتا۔ اس قرارداد کے مطابق وہ محض عضوِ معطل بن کر رہ جاتے ہیں.... میرے خیال میں ایک ایسی مملکت میں، جس میں مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہیں، مذہب کو اُمورِ مملکت میں دخل نہیں دینا چاہیے۔
>
> یہ صحیح ہے کہ ہندستان کے دو مملکتوں، یعنی بھارت اور پاکستان میں تقسیم ہوجانے سے پہلے ہم نے تقسیم ہند کی اس بنا پر مخالفت کی تھی، کہ اہلِ ہند ایک قوم پر مشتمل ہیں اور مسلم لیگ نے تقسیم کی اس وجہ سے تائید کی تھی کہ وہ دوقومی نظریے کی قائل تھی۔ ہمارے نقطہ ہاے نظر میں یہی اختلاف تھا.... لیکن کانگریس اب بھی اپنے اس ایک قومی نظریے پر قائم ہے۔

آخر میں انھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ:

> آپ مذہب کو سیاسیات سے علیحدہ رکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ آپ قدیم طرزِفکر سے نجات حاصل نہیں کرسکے۔ اس قرارداد کے پردے کے پیچھے میں نے جو کچھ سنا ہے وہ پاکستان کے معمار قائداعظم کی آواز نہیں ہے بلکہ اس ملک کے علما کی آواز ہے۔ یہ قرارداد

اس فرقہ وارانہ ذہنیت کی ترجمانی کرتی ہے۔

بات صرف 'ریاست' اور 'عوام' کے الفاظ کی نہیں، زندگی کے بارے میں دو نقطہ ہاے نظر کی تھی، جن کے لیے یہ عنوان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سردار عبدالرب نشتر نے کھل کر اس تاریخی قرارداد پر کانگریس کے اس مذموم حملے کا جواب دیا اور صاف لفظوں میں کہا کہ ہماری نگاہ میں سیاست اور مذہب دو علیحدہ چیزیں نہیں، اور ہماری ساری جدوجہد اسی تفریق دین و دنیا کے خلاف تھی، اور اب ہم اپنی جدوجہد کے اصل ہدف کی طرف پیش قدمی کریں گے اور اس سے انحراف کا سوچ بھی نہیں سکتے:

> جہاں تک اس مسئلے کا تعلق ہے، تمام دنیا جانتی ہے بالخصوص وہ حضرات جن کا تعلق برعظیم پاک و ہند سے ہے، اچھی طرح جانتے ہیں کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اس مسئلے کی بابت بنیادی اختلاف ہے۔ ہم مسلمانوں نے اور خود ہمارے محترم قائداعظم نے ہزارہا مرتبہ اس بات کا اعلان کیا ہے کہ ہمارا نظریۂ زندگی ہمارے دوستوں کے نظریۂ زندگی سے بالکل مختلف ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ ہمارا دین صرف اللہ تعالیٰ اور ہمارے تعلقات کی بابت محض احکام تک محدود نہیں ہے، بلکہ ہماری زندگی کے دیگر مسائل بھی دینی احکام کی روشنی میں ہی حل ہوتے ہیں۔ ہم نے ہمیشہ اپنے دین کی تعریف یہی کی ہے اور درست طور پر کی ہے کہ 'وہ ایک مکمل ضابطۂ حیات' (A Complete Code of Life) ہے۔

اس کے بعد سردار عبدالرب نشتر نے 'مملکت' اور 'عوام' کے تعلق پر واضح الفاظ میں روشنی ڈالی اور 'ریاست' کے لفظ کی ضرورت کو اس طرح واضح کیا کہ آپ بھی جانتے ہیں کہ 'عوام' کے منظّم اجتماعی اقتدار کو مملکت کہتے ہیں اور ہم بھی یہ کہتے ہیں کہ اختیارِ حکمرانی عوام کی وساطت سے، عوام کی منظّم اور صاحبِ اقتدار ہیئت اجتماعی کو حاصل ہوگا۔ پھر اعتراض کی گنجایش کہاں باقی رہ جاتی ہے۔ اصل مسئلہ 'ریاست' اور عوام کا نہیں، تصورِ دین اور تصورِ ریاست کا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کی شرط رکھی جائے تا کہ کوئی آمرِ مطلق نہ بن سکے۔

کانگریس کے ایک رکن نے یہ اعتراض بھی کیا تھا کہ یہ قرارداد قائداعظم کے انتقال کے بعد فوراً ہی کیوں پیش کی گئی ہے۔ تعجب ہے حالیہ عدالتی فیصلے میں بھی ایک محترم جج صاحب نے بھی

اپنے نوٹ میں ’قراردادِ مقاصد‘ کے بارے میں یہی سوالیہ لہجہ اختیار کیا ہے۔ معلوم نہیں اس میں کیا مصلحت پائی جاتی ہے (دیکھیے پیراگراف ۱۲۴، ص ۴۷۸، نوٹ از جسٹس میاں ثاقب نثار صاحب)۔ سردار نشتر نے کانگریس کے رکن کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

> ایک دوسرے معزز رکن کا اعتراض یہ تھا کہ: ’’قائداعظم کے انتقال کے بعد فوراً ہی ہم نے یہ قرارداد کیوں پیش کردی ___ گویا ہم کوئی بات قائداعظم کی مرضی کے خلاف کررہے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ قائداعظم نے خود اقلیتوں سے کچھ وعدے کیے تھے، لیکن (یہاں یہ بھی یاد رہے کہ) قائداعظم نے اکثریت سے بھی وعدے کیے تھے۔ پاکستان کا مطالبہ ایک مخصوص نصب العین کے پیشِ نظر اور ایک خاص غرض کے حصول کے لیے کیا گیا تھا، اور یہ قرارداد جو ہمارے سامنے پیش کی گئی ہے، انھی سنجیدہ وعدوں کے مطابق ہے جو قائداعظم اور مسلم لیگ کے دیگر قائدین نے اکثریت اور اقلیتوں سے کیے تھے۔ ہم نے کوئی ایسا کام نہیں کیا ہے، نہ ہم میں سے کوئی ایسا کام کرنے کی جرأت بھی کرسکتا ہے، جو قائداعظم کے اعلانات کے خلاف ہو۔

تحریکِ پاکستان کے ایک اور اہم قائد ڈاکٹر عمر حیات ملک نے کہا:

> ہم نے پاکستان کو بڑی قربانیوں کے بعد حاصل کیا ہے۔ ہمارے ۴۰ لاکھ لوگ شہید ہوئے ہیں۔ ہمارے ۷۰ لاکھ افراد بے گھر اور بے خانماں ہوگئے ہیں۔ ہم نے پاکستان حاصل کرنے کے لیے یہ تمام قربانیاں اس خاص غرض سے پیش کی تھیں کہ ’ہم یہاں اسلامی قوانین اور اسلامی اصولوں کے مطابق ایک مملکت قائم کریں گے‘ لیکن اب حزب اختلاف ہم سے یہ مطالبہ کررہی ہے کہ اپنے مقاصد کو ترک کردیں۔ یہ سب کچھ کرلینے، اس کش مکش سے گزر جانے اور یہ تمام قربانیاں دے دینے کے بعد، ہم اپنے اغراض و مقاصد سے دست بردار ہوجائیں اور یہ اعلان کردیں کہ ہمارا مطلب یہ نہ تھا۔ اس کے برعکس ہم صاف صاف کہتے ہیں: ’’ہم مسلمان ہیں اور ہم ایک اسلامی مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم آپ سے کہتے ہیں کہ آپ اپنے مذہب اور اپنی ثقافت کی پیروی کرنے میں بالکل آزاد ہیں اور آپ انھیں جس طرح چاہیں ترقی

دے سکتے ہیں۔ ہم اپنے قوانین آپ پر ٹھونسنا نہیں چاہتے، لیکن آپ ہمیں اپنے قوانین اور اپنے مخصوص طرزِ زندگی کے مطابق زندگی گزارنے دیجیے۔ ہم پاکستانیوں میں اتنی جرأت ایمان موجود ہے اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ تمام (انسانی) اقتدار، اسلام کے قائم کردہ معیارات کے مطابق استعمال کیا جائے۔

قائد ایوان جناب نواب زادہ لیاقت علی خان نے آخر میں بحث کو سمیٹتے ہوئے اور قرارداد کے منظور کیے جانے کی تحریک پیش کرتے ہوئے تمام اعتراضات کا بھرپور جواب دیتے ہوئے فرمایا:

جناب والا! میرے معزز دوست نے فرمایا ہے کہ ''پاکستان بننے کے بعد اب مسلم لیگ کا کام ختم ہوگیا ہے''۔ میں عرض کروں گا کہ مسلم لیگ کا محض آدھا کام ختم ہوا ہے اور آدھا ابھی باقی ہے، یعنی یہ کام باقی ہے کہ ہم پاکستان کو ایک تجربہ گاہ بنا کر اسلامی اصولوں پر عمل کریں اور اس طرح امنِ عالم اور انسانیت کی فلاح و بہبود میں اضافہ کرنے کے قابل بن جائیں۔ لہٰذا، میرے دوست کا یہ اشارہ کہ ''مسلم لیگ اپنا کام ختم کرچکی ہے''، صحیح نہیں ہے...... مجھے یقین ہے کہ اگر ہم اس قرارداد کے اصولوں کے مطابق دیانت داری اور خلوص کے ساتھ پاکستان کی تعمیروترقی کے لیے کام کرتے ہیں، تو ہم کامیاب ہوکر رہیں گے۔ ہم مملکت پاکستان کی بنیاد مادیت کے بجاے اخلاقیات اور زندگی کی بالاتر قدروں پر قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

'قراردادِ مقاصد' پاکستان کے دستور کے خدوخال ہی متعین نہیں کرتی، وہ ریاستِ پاکستان کے مقاصد اور پاکستانی قوم کی منزل کا تعین بھی کرتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جو اسے دستور کے خالق کی حیثیت دیتی ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ عدالت عظمیٰ کے متعدد محترم جج حضرات نے اپنے اس تاریخی فیصلے میں قرارداد اور دستور کے اس پہلو کو قرارِ واقعی اہمیت نہیں دی، اور 'ریاست' اور 'عوام' کی لفظی بحث میں ایسے اُلجھے ہیں کہ اسلامی اور مغربی تصور کے سیاست و ریاست کے بنیادی فرق کی تشریح و فہم کا حق ادا نہیں کرسکے۔

ضمناً ریکارڈ کی درستی کے لیے ہم یہ بھی عرض کرنے کی جسارت کر رہے ہیں کہ محترم جسٹس ثاقب نثار صاحب نے 'قراردادِ مقاصد' کا جو متن اپنے فیصلے میں شامل کیا ہے اس میں ان سے

ایک بڑی فروگذاشت ہوگئی ہے۔ پیراگراف ۱۲۵، ص ۴۸۰ پر انھوں نے Pakistan Objectives Resolution 1949 کے عنوان کے تحت قرارداد کا جو متن دیا ہے، وہ حرف بہ حرف قرارداد کا اصل متن نہیں ہے، بلکہ اس قرارداد سے اخذ کردہ ہے، جسے دستور ۱۹۷۳ء کے دیباچے کے ایک حصے کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ یہ دو اعتبار سے ۱۹۴۹ء کی اصل قرارداد سے مختلف ہے، یعنی:

۱- پہلی دفعہ میں 'ریاست' کے بجائے 'عوام' (People) دیا گیا ہے اور

۲- دوسری دفعہ اصل قرارداد میں اس طرح ہے:

یہ دستور ساز اسمبلی پاکستان کے عوام کی نمایندگی کرتے ہوئے طے کرتی ہے کہ دستور خودمختار آزاد ریاستِ پاکستان کے لیے بنایا جائے۔

جیسا کہ یہ عوام کی مرضی ہے کہ وہ ایک نظام قائم کریں۔

ہم پورے ادب سے عرض کریں گے کہ جب اس دستاویز کا متن دیا جا رہا ہو تو اسے پوری احتیاط سے دیا جانا چاہیے۔ اس قسم کی سہل انگاری کا عدالت کے ایسے اہم فیصلے میں دَر آنا کوئی اچھی مثال نہیں۔

'قراردادِ مقاصد' جہاں ہمارے دستوری سفر کا پہلا قدم ہے اور قوم کی اصل منزل اور مقصود کا معتبر ترین اظہار و اعلان ہے، وہیں یہ ان عناصر کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی رہی ہے جو لبرل اور سیکولر نظام کے علَم بردار ہیں اور کبھی سامنے سے اور کبھی پشت پر سے اس پر حملہ آور ہوتے رہتے ہیں۔ پنجاب کے فسادات کی انکوائری رپورٹ میں (جسے عرفِ عام میں 'منیر رپورٹ' کہا جاتا ہے) اس ('قراردادِ مقاصد') پر مختلف انداز میں جھپٹنے کی کوشش کی گئی۔ پھر جب جنرل ایوب خان نے ۱۹۵۶ء کے دستور کو منسوخ کیا اور اس کی جگہ اپنا خودساختہ دستور ۱۹۶۲ء مسلط کیا، اس میں جہاں پاکستانی ریاست کا نام تبدیل کر کے 'اسلامی جمہوریہ پاکستان' کی جگہ صرف 'جمہوریہ پاکستان' قرار دینے کی کوشش کی گئی، وہیں 'قراردادِ مقاصد' میں بھی ایسی ترامیم کر ڈالیں، جو اس کی شکل کو بگاڑنے اور روح کو مجروح کرنے والی تھیں۔ لیکن خوش آیند امر یہ ہے کہ ۱۹۶۲ء کے اس دستور کے تحت جو قومی اسمبلی وجود میں آئی، اس میں پہلا موضوع جس پر کھل کر بحث ہوئی، وہ پاکستان کے نظریاتی تشخص کا موضوع تھا اور اس بحث کا مقصد 'قرارداد مقاصد' کو ان تبدیلیوں سے پاک کرنا تھا جو فوجی

آمریت کے دور میں جبری طور پر چور دروازے سے دَر آئی تھیں۔

سیاسی جماعتوں کا قانون اور 'قراردادِ مقاصد'

یہ بھی تاریخ کے ایک انتقام سے کم نہ تھا کہ وہی مولوی تمیزالدین خان جو اس اسمبلی کے اسپیکر تھے، جسے ملک غلام محمد نے غیرقانونی طور پر برطرف کیا تھا، اور جس پر اُس وقت کے چیف جسٹس جناب محمدمنیر نے مہرتصدیق ثبت کی تھی، اور اب جنرل ایوب خان کے وزیرقانون تھے۔ اب اس نئی اسمبلی کے اسپیکر منتخب ہوئے۔ اپنے انتخاب کے بعد انھوں نے پہلی تقریر میں پاکستان کے نظریے کے تحفظ اور فروغ کی بات پوری قوت اور استدلال سے پیش کی۔ اس قومی اسمبلی میں جولائی ۱۹۶۲ء میں 'قراردادِ مقاصد' اور دستور، قانون اور اجتماعی زندگی پر اس کے اثرات پر تفصیل سے بحث ہوئی اور پھر پاکستان میں سیاسی جماعتوں کا قانون زیربحث آیا۔ اس میں متحدہ پاکستان کی قومی اسمبلی نے سیاسی جماعتوں کے لیے اسلامی نظریے کو بحیثیت 'نظریۂ پاکستان' شامل کیا اور ضروری قرار دیا کہ جو سیاسی جماعت ملک میں قائم ہو' وہ اسلامی نظریے یا پاکستان کی وحدت یا سلامتی کے خلاف نہ ہو'۔ اس بحث میں صدر جنرل محمد ایوب کی کابینہ کے وزیر جناب ذوالفقارعلی بھٹو نے اسمبلی کے ایوان میں جو بیان دیا تھا، اسے سامنے رکھنے کی ضرورت ہے:

> جناب عالی! دستور میں پہلے ہی یہ واضح طور پر لکھا جاچکا ہے کہ اسلام ہماری ریاست کی اساس ہے۔ یہ حقیقی صورت ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ دیباچہ (preamble) قابلِ نفاذ ہے یانہیں؟ ایک دیباچہ دستور کی کلید ہوتا ہے۔ یہ دستور کا منشور ہے۔ دستور کے اس مثالی چارٹر (ضابطے) میں یہ کہا گیا ہے کہ پاکستان ایک علاقائی ریاست سے ممتاز ایک نظریاتی ریاست ہوگا۔ اگر ہمارے نظریۂ حیات کو چیلنج کیا گیا تو ہم اپنے نظریۂ حیات کی برتری ثابت کریں گے۔ ہمیں مسلمان ہونے پر فخر ہے۔ ہم اپنے مذہب کے لیے جان دے دیں گے اور اپنے نظریۂ حیات کے لیے بھی جان دے دیں گے.... اگر سیاسی جماعتوں کا اہم ترین ......مقصد کسی ایک ملک کی حکومت کو سنبھالنا ہے، تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ دستور کی روح اور مینڈیٹ کے ساتھ مطابقت رکھتی ہوں۔ اگر پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے، تو سیاسی جماعتوں کے لیے یہ لازمی ہے کہ وہ دستور

کے بنیادی احکامات (dictates) کے عین مطابق کام کریں۔ (National Assembly of Pakistan Proceedings، ۱۱ جولائی ۱۹۶۲ء، ص ۱۳۵۵-۱۳۵۶)

دیکھیے ' قراردادِ مقاصد' اس وقت صرف دستور کا دیباچہ تھی۔ اس دیباچے کے پورے دستور اور سیاسی نظام کے لیے کیا تقاضے تھے، یہ شروع ہی سے واضح تھے۔

سابق چیف جسٹس کارنیلیس کا اعتراف

آیئے، دیکھیں کہ اس سلسلے میں پاکستان کے سابق چیف جسٹس جناب اے آر کارنیلیس (جو خود رومن کیتھولک تھے مگر پاکستان کے مزاج شناس اور دستور سے وفا کا تعلق رکھتے تھے) کیا کہتے ہیں۔ ۱۱ مارچ ۱۹۶۵ء کو ایس ایم لا کالج، کراچی میں دوسری کُل پاکستان لا کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے ان کا ارشاد تھا:

> عظیم ' قراردادِ مقاصد' بھی ہمارے دستور کا حصہ ہے، جو آزادی عطا ہونے کے فوراً بعد کے زمانے میں، دستور سازی کے دوران بہترین ذہنوں کے اتفاق رائے کی نمایندگی کرتی ہے۔ ' قراردادِ مقاصد' میں پاکستان کے دنیوی معاملات کے لیے یہ کہا گیا ہے کہ ان کو جمہوری انداز میں طے (conduct) کیا جائے تاکہ اسلام کے احکام کے مطابق مساوات، رواداری اور معاشرتی انصاف کو یقینی بنایا جاسکے۔ بنیادی حقوق بذاتِ خود اللہ تعالیٰ کے احکامات میں سے ہیں، جو جمہوری انداز میں معاشرتی عدل، رواداری اور انصاف کے لیے رہنمائی کرسکتے ہیں۔ ایک جج جو دستور کے دیے ہوئے بنیادی حقوق کی تفصیلی وضاحت (expound) کرتا ہے، اس سے اُمید کی جاتی ہے کہ وہ ان اعلیٰ ذرائع سے تحریک پائے گا، جو ہمیشہ کے لیے قرآنِ مجید کے الفاظ میں ثبت (inscribe) کردیے گئے ہیں۔ اگرچہ عدالتوں میں بنیادی حقوق کے اطلاق سے متعلق مقدمات میں مسائل و معاملات کی ایک بڑی تعداد بھی زیربحث آتی رہتی ہے، تاہم عدالت کبھی کبھار ہی اس سوال پر اس لحاظ سے غور (adress) کرتی ہے کہ اس قانون کو اسلام کے اصولوں کے حوالے سے کس طرح سمجھا جائے؟ میں مستقبل میں وہ دن دیکھتا ہوں جب ایک وکیل اپنے مقدمے کے حقائق بیان کرنے کے بعد عدالت کے سامنے اس طرح

اپنا نقطۂ نظر رکھے گا کہ متعلقہ آیاتِ قرآنی کا صورتِ حال پر کس طرح اطلاق کیا جائے۔ پاکستان میں مذہبی شعور کے تحت بنیادی حقوق کا اطلاق ہونا چاہیے۔ بنیادی حقوق کی وضاحت اور اطلاق اسلام کی اخلاقی اقدار کے مطابق مساوات، برداشت اور معاشرتی انصاف کو یقینی بنانے کے لیے دنیا کے ملکوں میں رائج جمہوری انداز میں کیا جاسکتا ہے۔ دنیا کے تمام ملکوں میں صرف پاکستان ہی وہ ملک ہے جہاں دستور کے تقاضوں کے تحت دنیوی معاملات کو مذہبی شعور کے تحت دیکھا جاتا ہے۔ (Law and Judiciary in Pakistan اے آر کارنیلیس، تدوین وادارت: ڈاکٹر ایس ایچ حیدر۔ لاہور لا ٹائمز پبلی کیشنز، لاہور، ص ۶۶-۶۷)

جسٹس اے آر کارنیلیس نے پاکستان کے دستور کے موضوع پر ڈھاکہ میں کونسل آف نیشنل انٹگریشن کے اجلاس سے، ۱۵ جون ۱۹۶۷ء کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

دستور کا دیباچہ ['قراردادِ مقاصد'] یہ تقاضا بھی کرتا ہے کہ اسلام نے جمہوریت، آزادی، رواداری اور معاشرتی انصاف کے جو اصول واضح طور پر بیان کیے ہیں، انھیں مکمل طور پر اختیار کیا جانا چاہیے۔ اگر تسلیم شدہ نظام (حکومت) اور اس مقصد کو حاصل کرنے کی خواہش کو عمل میں نہ لایا جائے تو یہ دستور سے دھوکا ہوگا۔ اس مقصد کو مختصر طور پر اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ ایک انسانی معاشرے میں ہر فرد کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے پورا موقع ملنا چاہیے اور جمہوریت اس طرح کی ہو جہاں مذہب اسلام کے اعلیٰ اصولوں کے مطابق 'انصاف سب کے لیے برابر' کا اصول رائج ہو۔

اس خطبے کا اختتام جسٹس کارنیلیس نے اس طرح کیا:

ہمارا دستور ہر چیز کو ایک واحد متحد (unifing) کرنے والے مرکزی اصول کے ساتھ مربوط کرتا ہے۔ ایک ایسا متحد کرنے والا اصول، جس کے تحت ہر معاملے میں ہمہ مقتدر طاقت ہے جس کے سامنے حکومت کے اعلیٰ ترین عہدے دار سے لے کر ایک عام شہری تک اپنے تمام اعمال کی جواب دہی کے لیے پلٹے گا۔ ۱۲ صدیوں میں اسلامی تعلیمات کے نتیجے میں روایت اور ثقافت میں جو ارتقا ہوا ہے، اس کے جواز کے لیے

دستور اعتماد دیتا ہے۔ اس یقین پر مبنی انسانی نسل کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ زمین پر امن کا ایک اخلاقی نظام قائم کیا جائے۔ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان کے عوام، یعنی مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے آگے بڑھنا چاہیے۔ اسلام کا اخلاقی نظم و ضبط، انصاف اور سچائی کے بنیادی تصورات پر مبنی ہے۔ اس وجہ سے ایک منصفانہ معاشرے کے قیام کے امکانات بہت روشن ہیں۔ یہ وہ روح ہے جسے میں دستور کے ضمیر کی حیثیت سے سمجھا ہوں۔ (ایضاً، ص ۱۷۲-۱۷۴)

جسٹس کارنیلیس نے اس سلسلے میں عدالت کے کردار کو بھی بڑی وضاحت سے بیان کرتے ہوئے ارشاد کیا ہے:

جب کوئی مقنّنہ، ایسا قانون منظور کرتی ہے جو بنیادی حقوق کی براہِ راست خلاف ورزی کرتا ہے، وہ قانون دستور کی رُو سے غیر مؤثر (void) ہے، اور عدالتیں رٹ (writ) کی حدود پر عمل درآمد کرتے ہوئے اس قانون کو کالعدم قرار دے سکتی ہیں۔ (ایضاً، ص ۹۴)

اور بات بنیادی حقوق تک محدود نہیں۔ جسٹس کارنیلیس بڑی صراحت اور جرأت سے کہتے ہیں کہ:

لیکن عوام یہ بھی خواہش کرسکتے ہیں کہ عدالتیں، تمام اُمور میں (جو وہ سرانجام دیتی ہیں) قانون کا نفاذ قرآن وسنت کے مطابق کریں جیسا کہ دستور میں مطلوب ہے۔ ہر شخص کو یہ سوال درپیش ہے کہ آیا وہ اپنے فرائض مناسب طور پر ادا کر رہا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سوال ہر وکیل کے ذہن میں بھی ہونا چاہیے، جب وہ کسی خاص معاملے پر دلائل دینے کے لیے کھڑا ہو کہ کیا میں یہ کام دستور کے تقاضوں کے مطابق کر رہا ہوں، یا بلاشبہہ اس مقصد کے مطابق کر رہا ہو کہ جس کے لیے ملک قائم کیا گیا تھا؟

اور وہ مقصد کیا ہے؟ ایک خداترس اور پاکستان کے وفادار غیر مسلم ماہر قانون کی زبان سے سن لیجیے:

یہ ایک حقیقت ہے کہ فقہا اور فلسفی دونوں فلسفے کے سیاسی یا ریاستی ہیئت کے معاملات میں اعلیٰ ترین سطح پر ان کے نتائج سے کتنے ہی متنبہ کیوں نہ ہوں، شریعت کے حتمی احکامات واقدامات (جو کچھ وہ کہتے ہیں) کی طرف بار بار پلٹتے ہیں۔ اس کا واضح ہدف یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی زندگی اس طرح گزارنی چاہیے، جس طرح اللہ نے اس کے لیے

مقدس کتابوں میں درج کی ہے۔ پوری قوم کو بھی اپنے تمام معاملات میں یہ ہدایت ملحوظ رکھنی چاہیے۔ اس کے نتیجے میں اس دنیا کے ساتھ، بعد کی دنیا میں بھی تحفظ اور سلامتی فراہم ہوجائے گی۔ چنانچہ مجھے یقین ہے کہ ایک مسلم ملک میں زندگی شریعت کے مطابق گزاری جانی چاہیے۔ (ایضاً،ص۳-۳۸۲)

دستوری جدوجہد کے مراحل

'قراردادِ مقاصد' کے کیا تقاضے ہیں اور دستور کس نظامِ زندگی کا مطالبہ کرتا ہے؟ اس میں کوئی ابہام نہیں۔ ہر دور میں ایک مخصوص طبقے نے ذہنوں کو تذبذب، اور شکوک وشبہات سے آلودہ کرنے اور گاڑی کو پٹڑی سے اُتارنے کی کوشش کی ہے لیکن بالآخر قوم کے دل کی آواز غالب آ کر رہی ہے۔ اس سفر کے چند مراحل پر نگاہ ڈالنے سے اس کش مکش کے خدوخال اور پھر کش مکش سے نکلنے کا راستہ بچشم سر دیکھا جاسکتا ہے۔

'قراردادِ مقاصد' ۱۲مارچ ۱۹۴۹ء کو منظور کی گئی اور دستورسازی کی طرف پہلے قدم کے طور پر اس دن جو کمیٹی یعنی Basic Principles Committee (بنیادی اصولوں کی کمیٹی) قائم ہوئی، اس کمیٹی نے 'قراردادِ مقاصد' کی روشنی میں کام کرنے کے لیے پہلا کام یہ کیا کہ اس نے 'تعلیمات اسلامیہ بورڈ' قائم کیا جس کے سربراہ مولانا سیّد سلیمان ندوی تھے، اور یہ بورڈ جید علما پر مشتمل تھا۔ مولانا ظفر احمد انصاری اس کے سیکرٹری تھے۔ 'بنیادی اصولوں کی کمیٹی' کی پہلی رپورٹ ستمبر ۱۹۵۰ء میں پیش ہوئی اور اس میں 'قراردادِ مقاصد' کو ریاست کے رہنما اصول (Directive Principles of State Policy) کے طور پر تجویز کیا گیا۔

اس کے بعد دستور کا جو بھی خاکہ بنا، اس میں سرفہرست 'قراردادِ مقاصد' تھی۔ ۱۹۵۶ء، ۱۹۶۲ء اور پھر ۱۹۷۳ء کے دساتیر میں 'قراردادِ مقاصد' دیباچے کے طور پر شامل تھی۔ ریاست کے رہنما اصولوں میں 'قراردادِ مقاصد' کے اصول واحکام کی صراحت تھی اور یہ اصول طے کیا گیا تھا کہ:

''کوئی قانون سازی قرآن وسنت سے متصادم نہیں کی جاسکے گی اور موجودالوقت تمام قوانین کو بھی ایک معقول مدت میں قرآن وسنت کے مطابق کر دیا جائے گا''۔

'قراردادِ مقاصد' کو مجروح اور غیرمؤثر کرنے، اور دستور سے اسلامی دفعات کو نکالنے یا

غیر مؤثر کرنے کی پہلی اور آخری کوشش جنرل محمد ایوب خان کے دورِ حکومت میں کی گئی۔ انھوں نے ۱۹۶۳ء میں جو دستور ایک آمر کی حیثیت سے ملک پر مسلط کیا، اس میں 'اسلامی جمہوریہ پاکستان' کے نام سے 'اسلامی' نکال دیا گیا اور اسے صرف 'جمہوریہ پاکستان' بنادیا۔ تاہم 'قراردادِ مقاصد' کو دستور کے دیباچے کے طور پر شامل ضرور کیا مگر اس کا سب سے اہم پہلو، یعنی ''تمام اُمورِ حکمرانی قرآن وسنت کی حدود میں [یعنی: .within the limits prescribed by Him] انجام دیے جائیں گے''، حذف کردیا گیا۔ اسی طرح یہ دفعہ کہ ''قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون سازی نہیں کی جاسکتی اور قانون سازی کے لیے رہنمائی فراہم کرنے کے لیے ایک 'کونسل آف اسلامک آئیڈیالوجی' ہوگی'' کو بھی دستور سے خارج کردیا گیا۔ صدر موصوف کا خیال تھا کہ وہ ڈنڈے کے زور پر 'قراردادِ مقاصد' اور دستور کی اسلامی دفعات کو غیرمؤثر کردیں گے لیکن ۱۹۶۲ء کے دستور کے تحت ان کے اپنے طے کردہ نظام کے ذریعے جو اسمبلی وجود میں آئی، اس نے پہلا کام یہی کیا کہ اس نے 'قراردادِ مقاصد' اور دستور پر ان چیرہ دستیوں کا نوٹس لیا۔ پہلے ہی اجلاس میں ایک قرارداد اس موضوع پر آئی کہ ملک کے تمام قوانین کو قرآن وسنت سے ہم آہنگ کیا جائے اور طویل بحث کے بعد یہ قرارداد منظور ہوگئی۔

پھر حکومت، سیاسی جماعتوں کے بارے میں ایک قانون Political Parties Act کے نام سے لائی۔ اس قانون کو اس وقت کے وزیر قانون (سابق چیف جسٹس آف پاکستان) محمد منیر صاحب نے پیش کیا۔ اس قانون میں سیاسی جماعتوں کے لیے شرط تھی کہ وہ پاکستان سے وفاداری کا عہد کریں گی، اور کوئی ایسی جماعت وجود میں نہیں آسکے گی، جو پاکستان کی سلامتی اور تحفظ کے باب میں معتبر نہ ہو۔ یہ قانون، کمیٹی کے سپرد ہوا، جس نے ترمیم کی کہ وفاداری صرف پاکستان کی سلامتی اور تحفظ ہی سے نہیں بلکہ پاکستان کے نظریے (Ideology of Pakistan) سے بھی ہونی چاہیے۔

جسٹس (ر) محمد منیر صاحب اور دوسرے وزرا نے پہلے تو بل کو اصل شکل میں منظور کرانے کی کوشش کی، اور بہت سی حیلہ سازیوں سے راستہ نکالنے کی کوشش بھی کی، لیکن ایوان میں کی جانے والی تقاریر اور ارکان کے موڈ کو دیکھتے ہوئے انھیں پسپائی اختیار کرنی پڑی اور بالآخر 'اسلامی نظریے سے وفاداری' قانون کا حصہ بنی۔ جسٹس (ر) محمد منیر صاحب کی تقاریر سے دو اقتباس صورتِ حال کو

سمجھنے میں بڑے معاون ہوں گے۔ ۱۱ جولائی ۱۹۶۲ء کو بحث کا رُخ دیکھ کر انھوں نے فرمایا:

> جناب عالی! اصل میں لفظ آئیڈیالوجی موجود نہیں ہے۔ جب میں بل کو ڈرافٹ کر رہا تھا، میں نے اس سوال پر غوروخوض کیا کہ آیا لفظ آئیڈیالوجی آنا چاہیے یا نہیں؟ بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ اس لفظ کو شامل نہ کروں۔ کیونکہ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ ان الفاظ، یعنی 'نظریۂ پاکستان' کی تعریف کرنا بہت مشکل ہو جائے گا، لیکن سیلکٹ کمیٹی نے اس لفظ کو شامل کر دیا ہے اور اب ایک ترمیم لائی گئی ہے کہ الفاظ آئیڈیالوجی آف پاکستان کی تعریف بطور اسلام کی جائے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں اس بارے میں بے تعلق ہوں کہ لفظ آئیڈیالوجی ہونا چاہیے، یا نکال دینا چاہیے، یا اس کی تعریف بطور اسلام کی جانی چاہیے، میں یہ بات ایوان پر چھوڑتا ہوں۔

ایوان نے پورے زور وشور سے 'اسلامی نظریۂ' کو قانون میں شامل کیا اور پھر جسٹس (ر) محمد منیر صاحب (جنھوں نے پنجاب کے فسادات پر کورٹ آف انکوائری رپورٹ میں اسلام اور اسلامی ریاست کے تصور پر بہت اوچھے وار کیے تھے) ترمیم کے بارے میں 'ہاں' کہنے پر مجبور ہوئے۔ یہ الگ بات ہے کہ ۱۵ برس بعد انھوں نے اپنی کتاب *From Jinnah to Zia* میں نہ صرف یہ کہ ایک بار پھر اپنی پرانی پوزیشن کا اعادہ کیا، بلکہ قائداعظم (کے بیانات کے الفاظ تبدیل کر کے) انھیں سیکولرزم کا حامی بنا کر پیش کرنا چاہا اور 'نظریۂ پاکستان' کو جنرل ضیا کی اختراع قرار دیا اور 'قراردادِ مقاصد' کو قائداعظم کے تصورِ پاکستان کے منافی گردانا، لیکن دیکھیے یہاں وہ کیا کہتے ہیں:

> میں نے اس معاملے پر خوب غوروفکر کیا ہے اور میں یہ قرارداد پیش کرتا ہوں کہ 'آئیڈیالوجی' کے الفاظ کو شامل کرنا کسی بھی طرح اقلیتوں کی مذہبی آزادی کو متاثر نہیں کرے گا، اور میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ یہ اقلیتوں کو اجازت دے گا کہ وہ اپنی جماعتیں اس شرط کے ساتھ قائم کر سکیں کہ اپنی سیاسی سرگرمیوں کو ایسے پروپیگنڈے میں تبدیل نہ کر دیں، جو اسلامی تعلیمات کے خلاف ہوں۔

ایک رکن اسمبلی جناب محبوب الحق نے سابق جج صاحب کو یاد دلایا کہ منیر رپورٹ کے ص ۲۰۱ پر انھوں نے اس سے مختلف بات کی ہے، لیکن اسپیکر نے اعتراض کو رد کر دیا اور کہا کہ وہ ذاتی ریفرنسوں

کی اجازت نہیں دے سکتے۔ (لیکن کیا کیا جائے کہ تاریخ میں ذاتی یا غیر ذاتی ریفرنس محفوظ ہوجاتے ہیں، اور دنیا کے لیے نشانِ عبرت بھی بنتے ہیں)۔

قرآن وسنت کی روشنی میں تمام قوانین کی تبدیلی کی قرارداد اور سیاسی جماعتوں کے قانون میں 'اسلامی نظریہ' کا اضافہ دراصل 'قراردادِ مقاصد' کی اصل روح کا اعادہ تھے اور یہ دونوں جنرل ایوب خان اور ان کے سیکولر حواریوں کے لیے ایک تازیانے سے کم نہ تھے۔ فوجی حکمرانی کے تمام تر کروفر کے باوجود، انھیں یہ کڑوی گولی نگلنی پڑی۔

ان تبدیلیوں کے بعد اگلا مرحلہ خود دستور میں ترمیم کے ذریعے 'قراردادِ مقاصد' سے انحراف کی اصلاح کا تھا۔ یہ کام بھی قوم کے دباؤ میں اسمبلی نے شروع کر دیا اور بالآخر ۱۹۶۲ء کے دستور میں ترامیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ ایوان نے 'قراردادِ مقاصد' سے حدودُ اللہ کے دائرے میں اختیارات کے استعمال کی جس شق کو خارج کیا تھا، اسے بحال کر دیا گیا۔ مملکت کا نام دوبارہ 'اسلامی جمہوریہ پاکستان' قرار دیا گیا۔ قرآن وسنت سے متصادم قانون سازی پر پابندی کی دفعہ کو بھی بحال کیا گیا اور کونسل آف اسلامک آئیڈیالوجی کو بھی ایک دستوری ادارے کے طور پر دوبارہ قائم کیا گیا۔ اس طرح 'قراردادِ مقاصد' پر جو حملہ ہوا تھا، اسی اسمبلی نے جو فوجی آمر کے اپنے منصوبے کے مطابق وجود میں آئی تھی، اس کو غیر مؤثر کر دیا اور سیکولر لابی ہاتھ ملتی رہ گئی۔

اُوپر کی گزارشات سے دو باتیں واضح ہوجاتی ہیں: ایک یہ کہ 'قراردادِ مقاصد' تحریکِ پاکستان کے مقاصد کی ترجمان اور پاکستانی قوم کے جذبات، احساسات، عزائم اور تصورات کی مظہر ہے۔ یہ قوم اور ریاست کے درمیان اللہ کو گواہ کر کے ایک معاہدے کی حیثیت رکھتی ہے۔ دستور، حکمران اور تمام ریاستی ادارے بشمول مقنّنہ، انتظامیہ اور عدلیہ اس کے تابع اور پابند ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس میں تبدیلی یا اس سے انحراف، قوم کے لیے کسی شکل میں بھی قابلِ قبول نہیں۔ دستور کے لیے اس کی حیثیت ماں کی سی ہے جسے تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ قرارداد دستور کی صورت گر ہے، دستور کے تابع نہیں۔ اس کے دیے ہوئے اصول و احکام ہی دستور کا اصل جوہر ہیں اور ان کی تنسیخ یا ترمیم اس قوم کے لیے کسی صورت قابلِ قبول نہیں ہوسکتی۔ اس سلسلے میں جو بھی کوشش ماضی میں ہوئی، وہ ناکام رہی اور ان شاءاللہ مستقبل میں بھی ایسی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوسکتی۔ گیلپ، پیو (PEW)

اور NDI کے زیراہتمام کیے جانے والے تمام ہی عوامی جائزے اور سروے اس ایک بات پر متفق ہیں کہ پاکستان کی آبادی کی عظیم اکثریت (۸۰ سے ۹۰ فی صد) اُس نظام کے حق میں ہے جس میں شریعت کی بالادستی ہو۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ مسلمان بحیثیت قوم اپنی اجتماعی زندگی کی تشکیل اپنے دین کے مطابق کرنا چاہتے ہیں اور شریعت ہی ان کے لیے زندگی کی اصل شاہ راہ ہے۔

'قراردادِ مقاصد' بھارتی قرارداد کا چربہ؟

سپریم کورٹ کے زیربحث فیصلے میں فاضل جج جسٹس ثاقب نثار صاحب نے اپنے اضافی نوٹ میں جہاں بھارت کی دستوری تاریخ اور وہاں کے دستوری ڈھانچے کے تصور کے ارتقا اور موجود دستوری پوزیشن کا بڑی محنت اور بالغ نظری سے جائزہ لیا ہے، وہیں 'قراردادِ مقاصد' اور پاکستان کے دستور کے بارے میں کئی ایسی باتیں کہی ہیں، جن پر گفتگو کی ضرورت ہے۔

اختلاف راے زندگی کی ایک قابلِ قدر روایت ہے اور ہم اختلافی آرا کے احترام کے قائل ہیں، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جو باتیں حقائق کے منافی ہوں یا حالات کی غلط تعبیر کا ذریعہ بن رہی ہوں، ان پر گفتگو اور احتساب کا عمل روک دیا جائے۔ اصلاحِ احوال کے لیے ایسے اُمور پر بحث وتنقید فکری اور تہذیبی ترقی کے لیے ضروری ہے۔ ہم ان چند اہم اُمور کے بارے میں اپنی گزارشات پیش کرنا چاہتے ہیں جو انھوں نے اُٹھائے ہیں اور خود ان کو اور اہلِ علم کو دعوت دیتے ہیں کہ ان اُمور پر حقائق اور دلائل کی روشنی میں اپنی اپنی راے قائم کریں۔

ان کی یہ بات درست ہے کہ 'قراردادِ مقاصد' اور اس میں بیان کردہ اصول و احکام اور ۱۹۷۳ء کے دستور میں، جیسا کہ وہ اگست ۱۹۷۳ء میں نافذ ہوا تھا، بہت سے فاصلے اور کچھ تضادات تھے۔ ان کی یہ بات بھی درست ہے کہ دستور میں کئی ترامیم اس کا حلیہ بگاڑنے اور انسانی حقوق اور عدلیہ کے حقوق پر دست درازی کا دروازہ کھولنے کا ذریعہ بنیں، گو بعد میں ان میں سے بیش تر کو تبدیل کر دیا گیا۔ اسی طرح ان کی یہ راے بھی درست ہے کہ حالیہ ترامیم جن میں ۱۸ویں ترمیم خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے، تضادات کو کم کرنے اور دستور کو بحیثیت مجموعی بہتر بنانے کا ذریعہ بنی ہے، اور جس طرح وہ 'قراردادِ مقاصد' اور اس کے تقاضوں سے اور بھی ہم آہنگ ہو گیا ہے۔

'قراردادِ مقاصد' کی تعبیر اور اس کے مقام کے تعین میں اگرچہ ہمارے ذہنوں میں کوئی

ابہام نہیں ہے لیکن ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ اس باب میں ایک سے زیادہ آرا ہوسکتی ہیں اور دلیل کی بنیاد پر ان پر بحث اور مکالمہ ہونا چاہیے، تاہم، جن اُمور کے بارے میں ہم شدید اضطراب کا شکار ہیں، ان میں سرفہرست فاضل جج صاحب کا یہ دعویٰ ہے کہ: '''قراردادِ مقاصد'، پاکستان کی اپنی سوچ اور تخلیق نہیں بلکہ اس کا سلسلۂ نسب بھارت کی جنوری ۱۹۴۸ء کی بھارتی 'قراردادِ مقاصد' سے جاملتا ہے جو پنڈت نہرو نے پیش کی تھی۔ ان کا دعویٰ ہے کہ پاکستانی قرارداد اپنے عنوان اور مندرجات کے اعتبار سے بھارتی قرارداد کا چربہ ہے۔

بلاشبہہ جسٹس ثاقب نثار صاحب 'قراردادِ مقاصد' کے پہلے پیراگراف کو جس میں حاکمیت الٰہیہ کا اقرار ہے، تعریف و توصیف کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اسے بانیانِ پاکستان کے تصور کا عکاس تسلیم کرتے ہیں اور اعتراف کرتے ہیں کہ اس دفعہ میں اللہ کی حاکمیت کے تصور کو مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے، وہ اس امر کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اس میں عوام کے کلیدی کردار اور اقتدار کے ایک امانت ہونے کا تصور موجود ہے (پیراگراف ۱۲۳ اور ۱۲۴)۔ لیکن اس اعتراف کے معاً بعد وہ یہ سوال اُٹھا دیتے ہیں کہ: ''اس ابتدائیے اور اس کے بعد کی دفعات کی حیثیت مساوی نہیں ہے''۔ انھی کے الفاظ میں ان کے اشکال اور دعوے کو دیکھ لیجیے:

> تاہم بقیہ قرارداد کو بھی یہی حیثیت دینا واضح طور پر تاریخی ریکارڈ سے بہت دُور تک بہک جانا ہے۔ 'قراردادِ مقاصد' ۱۲ مارچ کو منظور ہوئی۔ قائداعظم چھے ماہ قبل رحلت کرچکے تھے۔ اس قرارداد کی تصوراتی بنیادیں اور مشتملات نہ پاکستان کے لیے اور نہ ملک کے اندر کوئی منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔ (فیصلہ: پیراگراف ۱۲۴)

جسٹس صاحب کا دعویٰ ہے کہ پنڈت نہرو نے بھارت کی دستورساز اسمبلی میں جو 'قراردادِ مقاصد' پیش کی اور جو ۲۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو وہاں منظور کی گئی، وہ پاکستان کی قرارداد کا منبع ہے اور پاکستانی قرارداد کی ہیئت (structure) حتیٰ کہ اس کے مندرجات (content) بھی بھارت کی قرارداد سے مستعار ہیں اور گویا اسی کا چربہ ہیں۔

تعجب ہے___! عنوان کا اشتراک اور ہیئت میں مشابہت کس طرح دو قراردوں یا دو مختلف قوانین کو ایک جیسا یا ایک دوسرے کا چربہ بنا دیتے ہیں؟ ہمارے لیے اس کا سمجھنا بہت مشکل ہے۔

پاکستانی اور بھارتی قرارداد کا موازنہ

دستور کا لفظ دنیا کے ۲۰۰ دساتیر میں مشترک ہے۔ سول لا، کریمنل لا، کمرشل لا، نہ معلوم کتنے قوانین ہیں، جن کے عنوان، ہیئت اور الفاظ تک سیکڑوں ملکوں کے قوانین میں مشترک ہوتے ہیں، لیکن محض اس ظاہری مماثلت سے وہ قانون نہ ایک دوسرے کا چربہ بن جاتے ہیں اور نہ ان کی انفرادیت اس سے متاثر ہوتی ہے بشرطیکہ ان کا اپنا مقصد واضح اور مؤثر ہو۔ دونوں کو 'قراردادِ مقاصد' کہنے سے، بعد کی قرارداد پہلی قرارداد کا سایہ اور طفیلی کیسے بن گئی؟ ہمارے لیے یہ ایک معما ہے۔ ہاں، مندرجات، اصولوں اور احکام کی بات دوسری ہے اور ان میں اگر مکمل مماثلت ہو تو وہ ایک حد تک شبہات کو جنم دے سکتی ہے۔ لیکن اس صورت میں بھی قرارداد یا قانون جامع وژن کو دیکھنا ہوگا، چند الفاظ کی مماثلت کو نہیں۔ اس لیے آیئے، اپنی توجہ مندرجات پر مرکوز کریں اور دونوں کا موازنہ کر کے دیکھیں کہ ان میں مشترکات کیا ہیں اور کون سی چیزیں ان کو ایک دوسرے سے مختلف اور ممتاز کرتی ہیں:

۱- بھارتی 'قراردادِ مقاصد' میں آٹھ دفعات ہیں اور پاکستانی 'قراردادِ مقاصد' میں ۱۲ دفعات ہیں۔

۲- پاکستانی قرارداد کا آغاز تصورِ کائنات، تصورِ حیات اور حکمرانی کے اصول و آداب کے ایک واضح تصور سے ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیت، انسان کی خلافت، اقتدار کے امانت ہونے اور اسے عوام کے منتخب نمایندوں کے ذریعے، مگر اللہ کی دی ہوئی حدود کے دائرے میں استعمال کیے جانے کے محکم اصول کے اثبات سے ہوتا ہے۔ بھارت کی قرارداد میں کسی تصورِ حکمرانی کا کوئی ذکر نہیں۔ وہ ہندستان کو ایک آزاد، خودمختار ریاست قرار دیتے ہوئے دستورسازی کے لیے ہدایت دیتی ہے۔ مستقبل کے وژن کا کوئی پرتو یا کسی خاص نظریاتی منزل کا کوئی اشارہ اس دیباچے میں نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسے اصل دستور میں شامل نہیں کیا گیا اور ایک دوسرا دیباچہ لکھا گیا جیسا کہ ہم آگے چل کر عرض کریں گے۔

۳- پاکستانی 'قراردادِ مقاصد' میں اسلام کو حکمرانی ہی نہیں، زندگی کے پورے نظام کے لیے رہنما اصول اور مسلمانوں کو اسلامی نظامِ حیات کی تعلیم اور ان کے مطابق زندگی کی صورت گری کے اہتمام اور اس کے لیے ریاستی وسائل کے استعمال کا حکم دیا گیا ہے۔ اس نوعیت کی کوئی بات بھارت کی قرارداد میں دُور دُور تک نہیں ہے، حتیٰ کہ بعد میں جس چیز کو دستور

کا حصہ بنایا گیا یعنی سیکولرزم اور سوشلزم، ان کا بھی کوئی ذکر اس قرارداد میں نہیں ہے۔ یہ امتیاز پاکستان کی قرارداد کو حاصل ہے کہ اس نے مذہب کے مروجہ سیاسی تصورات اور نظریات کے برعکس اسلام کے تصورِ کائنات اور اصولِ حکمرانی کو اپنی ریاست کی شناخت کے طور پر واضح الفاظ میں پیش کیا ہے اور اس طرح محض نیشن اسٹیٹ کے تصور سے ہٹ کر ایک اسلامی نظریاتی اسٹیٹ کا تصور دیا، اور یہ چیز قرارداد کی صرف شق نمبرا ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ مابعد کی شقوں میں بھی یہ صراحت موجود ہے۔ جس نے قرارداد کی تمام ہی دفعات کو مربوط کر دیا ہے۔

۴- ایک اور نہایت اہم پہلو یہ ہے کہ پاکستانی قرارداد کی زبان اور انداز اللہ کی حاکمیت کے ساتھ ایک نئے نظام کے قیام کا اعلان کرتا ہے اور یہ نظام عوام کی مرضی اور عزائم کے اظہار کی شکل اختیار کرنے تک محدود نہیں رہتا بلکہ تبدیلی کے ایک رُخ کو متعین کرتا ہے اور اس سمت میں پیش رفت کے لیے حاکمانہ انداز اختیار کرتے ہوئے ریاست اور اس کے تمام اداروں کو بتاتا ہے کہ انھیں کیا کرنا چاہیے۔ بھارت کی قرارداد روایتی انداز میں دستور میں کچھ چیزوں کو سمونے اور حاصل کرنے تک محدود ہے، جب کہ پاکستان کی قرارداد کا ہر جملہ ایک نئے نظام کے قیام کی دعوت کے ساتھ واضح ہدایت، حکم اور تبدیلی کا پیغام دے رہا ہے۔

۵- غیرمسلموں اور اقلیتوں کے سلسلے میں پاکستانی قرارداد میں دو دفعات ہیں، جب کہ بھارتی قرارداد میں صرف ایک دفعہ ہے۔

۶- پاکستانی قرارداد میں عدلیہ کی آزادی اور اس کے تحفظ کا واضح ذکر ہے، جو بھارتی قرارداد میں سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔

۷- عوام کے سرچشمۂ اختیار، حکمرانی کے ذریعے اور نمایندگی کے اصول کا جتنا واضح بیان پاکستانی قرارداد میں ہے ویسا بھارت کی قرارداد میں نہیں۔ پاکستانی قرارداد کے ابتدائیے میں کہا گیا ہے کہ: ''یہ اختیار جو پاکستان کے عوام استعمال کریں گے''۔

دوسری دفعہ میں اس پوری قرارداد کو عوام کی آواز قرار دیا گیا ہے، یعنی: ''یہ پاکستان کے عوام کی مرضی (will) ہے کہ ایک نظام قائم کیا جائے''۔

پھر تیسری دفعہ میں اس اصول کو ایک محکم قدر (value) کی حیثیت سے طے کر دیا گیا ہے کہ:
''جہاں ریاست اپنا اقتدار و اختیار عوام کے منتخب نمایندوں کے ذریعے استعمال کرے گی''۔
عوام کے کردار کے بارے میں یہ تین واضح احکام ہیں۔ بھارتی قرارداد کا انداز ہی بالکل مختلف ہے۔ اس میں دوسری اور تیسری دفعہ علاقوں اور ان کی حدود کا ذکر لیے ہوئے ہیں اور عوام کا ذکر صرف چوتھی دفعہ میں آیا ہے اور وہ بھی اس اعلان کی شکل میں کہ ساری قوت کا سرچشمہ عوام ہیں۔ منتخب نمایندوں کے ذریعے نظامِ حکومت کے چلانے کا جو واضح اعلان پاکستانی قرارداد میں ہے وہ بھارتی قرارداد میں نہیں ملتا۔

۸- دو دفعات ایسی ہیں کہ جن میں کچھ لفظی مشابہت پائی جاتی ہے۔ یہ مشابہت حقوق اور اقلیتوں کے تحفظ کی ضمانت کے بارے میں ہے، لیکن ان مسائل کے بارے میں دنیا کے تمام دساتیر'یونیورسل ڈیکلریشن آف ہیومن رائٹس'، 'یورو پین کنونشن آف ہیومن رائٹس'، 'بل آف رائٹس' سبھی میں تھوڑے بہت تغیر و تبدل اور تقدیم و تاخیر کے ساتھ ایک جیسی اصطلاحات اور الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس نوعیت کی مماثلت کو چوری اور نقالی قرار دینا حق و انصاف کا خون کرنے کے مترادف ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بھارتی قرارداد میں مختلف انسانی حقوق کا ذکر ہے لیکن انسانی حقوق (بحیثیت ایک مرکزی تصور (concept) کے) کا ذکر اس میں موجود نہیں، جب کہ پاکستانی قرارداد کے الفاظ زیادہ مؤثر اور واضح ہیں اور الفاظ کی ترتیب اہمیت رکھتی ہے کہ آغاز ہی میں بنیادی حقوق کے جامع تصور کو بیان کیا گیا ہے اور مختلف حقوق کا ذکر بعد میں ہے۔

کم از کم یہ آٹھ پہلو ایسے ہیں جن کی روشنی میں پاکستانی قرارداد اور بھارتی قرارداد کا واضح اور بیّن اختلاف اور فرق صاف دیکھا جاسکتا ہے۔ پاکستانی قرارداد اپنی نوعیت میں بالکل منفرد ہے۔ حاکمیت الٰہیہ، اللہ کی طے کردہ حدود کے اندر انسانی اقتدار کی کارفرمائی، اقتدار کا امانت ہونا، مسلمانوں کو قرآن و سنت کے مطابق زندگی گزارنے کے لائق بنانے کی دستوری ذمہ داری وغیرہ، ایسی چیزیں ہیں جو پاکستانی قرارداد کو ایک نظریے کی علَم بردار اور تبدیلی کی واضح سمت کو متعین کرنے والی بنا دیتی ہے۔ اور اس کی تمام دفعات ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ یہ کہنا بھی بہت بڑی زیادتی

ہے کہ پہلی دفعہ اور باقی دفعات کو مساوی حیثیت حاصل نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۲ کی ۱۲ دفعات ایک دوسرے سے مربوط اور ایک ہی ہار کے موتیوں کے مانند ہیں۔ بھارتی قرارداد میں ایسی کوئی چیز نہیں۔

پاکستانی 'قراردادِ مقاصد' کا دوسرا امتیازی پہلو ایک واضح نئے نظام کے قیام کے تصور کا حکمی انداز (command and direction) ہے جو بھارتی قرارداد، اس کی زبان اور طرزِ اظہار میں نہیں پایا جاتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بھارت میں وہاں کی 'قراردادِ مقاصد' کو دستور سازی کے لیے ایک ابتدائی ہدایت تو ضرور سمجھا گیا، لیکن اسے بجا طور پر اس لائق نہیں سمجھا گیا کہ نئے بھارتی دستور میں وہ دستور کے دیباچے کے طور پر شامل کی جائے، جب کہ پاکستانی 'قراردادِ مقاصد' کی، پاکستان کے دستور میں ایک مستقل اہمیت ہے۔ یہ ''قراردادِ مقاصد'' ایک وقتی ہدایت نہیں، ایک مستقل مشعلِ راہ ہے اور اسے دستور کا نہ صرف دیباچہ بنایا گیا ہے، بلکہ اس کو بالآخر دستور کا ایک قابلِ نفاذ حصہ بھی قرار دیا گیا ہے۔ بھارتی قرارداد اس لیے بھی دستور کے مقدمے کے لیے ناموزوں تھی کہ اس میں فیڈریشن کا جو تصور دیا گیا ہے، وہ بعدازاں تیار کردہ اور نافذ شدہ دستور کے برعکس ہے۔

مثال کے طور پر قرارداد کی دفعہ تین میں ملک کی مختلف ریاستوں اور انتظامی یونٹوں کے بارے میں، درگا داس باسو بھارتی دستور کے مشہور شارح کے مطابق یہ اصول بیان کیا گیا تھا کہ:

> خودمختار یونٹوں کی حیثیت (بشمول residuary یعنی باقی متعلقہ) اختیارات پر مقتدر ہوگی اور یہ حیثیت برقرار رہے گی۔
>
> دستور میں اس اصول کو تبدیل کر دیا گیا ہے اور فیڈریشنوں میں شامل ہونے والے یونٹوں کے متعلقہ حقِ اختیار کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ حقوقِ اختیار یونٹوں [صوبوں] کے بجائے مرکز کو دے دیے گئے۔ اس واضح تضاد کی موجودگی میں اس قرارداد کو دستور کا دیباچہ کیسے بنایا جاسکتا تھا۔ (Commentary on the Constitution of India، درگا داس باسو، کلکتہ ۱۹۵۵ء، جلد ا، ص ۳-۴)
>
> اس دستور کے ۷۵ فی صد کا آغاز تجربے کی روشنی میں [برطانوی گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں] کی گئی تبدیلیوں کے ساتھ ہوا ہے۔ بنیادی حقوق، امریکا کے دستور سے کشید کیے گئے ہیں۔ بعد کے دستور میں اضافوں کی دفعات آئرلینڈ سے متاثر ہیں۔

وفاقی حیثیت سے متعلق اُمور کینیڈا کے دستور سے لیے گئے ہیں۔(ایضاً)

دوسروں سے استفادے اور اخذ و اختیار کا اصل منظر تو بھارت کے دستور میں نظر آتا ہے، یا پاکستانی قرارداد میں؟ پاکستانی 'قراردادِ مقاصد' فی الحقیقت پاکستانی ہے اور اپنی نظیر آپ ہے۔

یہ امر ذہن نشین رہے کہ پنڈت نہرو والی 'قراردادِ مقاصد' اس لائق ہی نہ تھی کہ اسے دستور کا دیباچہ بنایا جاتا، اس میں کوئی وژن موجود نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت کے دستور میں جو دیباچہ دیا گیا ہے، اس میں پہلی 'قراردادِ مقاصد' سے ہٹ کر ایک وژن اور نظریہ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کی اوّلین شکل میں فرانس کے Justice, Liberty and Fraternity (انصاف، آزادی، اخوت) کے نعروں کو شامل کیا گیا تھا اور ملک کو sovereign democratic (مطلق فرماں روا جمہوریت) قرار دیا گیا تھا، لیکن وژن پھر بھی مبہم اور نامکمل تھا، اس لیے ایک خاص نظریاتی حیثیت کو اُجاگر کرنے کے لیے لفظ Republic (جمہوریہ) کی ضرورت محسوس ہوئی اور دستور میں ۱۶ برس بعد ۱۹۷۶ء میں ۴۲ویں ترمیم کے ذریعے socialist, secular کا اضافہ کیا گیا (ہمارے جج صاحب نے پیراگراف ۱۲۷ میں جو دیباچہ دیا ہے، وہ ترمیم سے پہلے کا ہے)، جب کہ پاکستان میں 'قراردادِ مقاصد' نے ۱۹۴۹ء ہی میں ملک کی نظریاتی حیثیت کو بالکل واضح کر دیا تھا اور پاکستان کے پہلے دستور (۱۹۵۶ء) میں 'قراردادِ مقاصد' دستور کے تاج کے طور پر، بطور دیباچہ شامل ہوئی اور ملک نے بڑے اعتماد سے خود کو Islamic Republic of Pakistan (اسلامی جمہوریہ پاکستان) قرار دیا ہے۔

بھارت نے ۲۸ سال بعد، دیباچے میں ترمیم کر کے sovereign democratic (مطلق فرماں روا جمہوریت) سے پہلے socialist, secular (سوشلسٹ، سیکولر) کا اضافہ کیا اور یوں قسطوں میں اپنی شناخت کا اظہار کیا۔

'قراردادِ مقاصد' اور نظریاتی تشخص

جناب جسٹس ثاقب نثار، بھارت کے دستور کو اس اعتبار سے بھی زیادہ معتبر اور محترم قرار دیتے ہیں کہ اسے بھارت کی تحریکِ آزادی کے قائدین نے مرتب کیا اور پاکستان کے ۱۹۷۳ء کے دستور کے بارے میں ان کو یہ 'تشویش' لاحق ہے کہ: ''اسے جس قیادت نے مرتب کیا وہ دوسری نسل سے تعلق رکھتی ہے۔ اس اعتبار سے ۱۹۷۳ء کے دستور کو وہ تقدس حاصل نہیں جو بھارت کے دستور کو

حاصل ہے''۔لیکن تعجب ہے کہ 'قراردادِ مقاصد' جسے بانیانِ پاکستان نے، اور پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی نے مرتب کیا، اور جسے قائداعظم کے اقوال اور تحریکِ پاکستان کے دوران میں مسلم عوام سے کیے جانے والے وعدوں کے مطابق مرتب کیا گیا، اسے وہ معتبر ماننے میں تردّد محسوس کرتے ہیں۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کرچکے ہیں وزیراعظم لیاقت علی خان نے 'قراردادِ مقاصد' پیش کرتے ہوئے پہلی بات یہی کہی تھی کہ یہ قرارداد قائداعظم کے تصور کے مطابق پیش کی جارہی ہے۔ دوسرے قائدین نے بھی دستور ساز اسمبلی میں اس کا برملا اظہار کیا اور وہ سب قائدین تحریکِ پاکستان کے روحِ رواں تھے اور یہ قرارداد تحریکِ پاکستان کے فلسفے کا منطقی اظہار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس 'قراردادِ مقاصد' نے بعد کے دساتیر کو بھی معتبر بنانے میں کردار ادا کیا ہے۔

۱۹۷۳ء میں پاکستان کے دستور میں 'قراردادِ مقاصد' کے ۱۹۴۹ء کے متن کے بعد دیباچے میں جو اضافہ کیا گیا ہے، وہ بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ہر اعتبار سے پاکستان کے نظریاتی اور تاریخی تشخص کا عکاس ہے اور پاکستان کے دستور کو تاریخ تحریکِ پاکستان سے مربوط کرتا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے:

> لہٰذا، ہم جمہورِ پاکستان، قادرِ مطلق اللہ تبارک وتعالیٰ اور اس کے بندوں کے سامنے اپنی ذمہ داری کے احساس کے ساتھ،
>
> پاکستان کی خاطر، عوام کی دی ہوئی قربانیوں کے اعتراف کے ساتھ،
>
> بانیِ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کے اس اعلان سے وفاداری کے ساتھ،
>
> کہ پاکستان سماجی عدل کے اسلامی اصولوں پر مبنی ایک جمہوری مملکت ہوگی، اس جمہوریت کے تحفظ کے لیے وقف ہونے کے جذبے کے ساتھ، جو ظلم وستم کے خلاف عوام کی اَن تھک جدوجہد کے نتیجے میں حاصل ہوئی ہے،
>
> اس عزم بالجزم کے ساتھ کہ ایک نئے نظام کے ذریعے مساوات پر مبنی معاشرہ تخلیق کرکے اپنی قومی وحدت اور یک جہتی کا تحفظ کریں، بذریعہ ہٰذا،
>
> قومی اسمبلی میں اپنے نمایندوں کے ذریعے، یہ دستور منظور کرکے اسے قانون کا درجہ دیتے ہیں اور اسے اپنا دستور تسلیم کرتے ہیں۔

’قراردادِ مقاصد‘ اور اس کے، بطور تتمہ اس اضافے کا موازنہ بھارت کی ۱۹۴۸ء کی ’قراردادِ مقاصد‘ اور ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۷ء کے دستوری دیباچوں سے کریں تو زندگی، سیاست اور حکمرانی کے دو بالکل مختلف تصورات کا منظر سامنے آتا ہے۔ نیز آٹھویں اور ۱۸ویں ترامیم کے ذریعے دستوری دفعہ ۲-اے اور ۱۹۴۹ء کی قرارداد کا دستور کی قابلِ نفاذ دفعہ بنا دینے اور آٹھویں ترمیم میں جو لفظی سقم رہ گیا تھا، اس کی اصلاح نے ’قراردادِ مقاصد‘ کی اثرانگیزی میں بیش بہا اضافہ کر دیا ہے۔ ہمارا مسئلہ دستور اور قوم دونوں میں نظریے اور وژن کے فقدان کا نہیں ہے، بلکہ مسئلہ، اس نظریے اور وژن کے مطابق سعی و جہد میں شدید کوتاہی کا ہے، نیز مسئلہ ایسی قیادت سے محرومی کا ہے، جو اس نظریے کی وفادار ہو، دیانت دار ہو اور باصلاحیت بھی۔

دستورِ پاکستان ایک انسانی کاوش ہے اور ’قراردادِ مقاصد‘ بھی آسمانی صحیفہ نہیں لیکن یہ دونوں اپنی موجودہ شکل میں بڑی حد تک اس تصور اور نقشۂ کار کو پیش کر رہے ہیں جس پر خلوص اور محنت کے ساتھ عمل کر کے ہم اسلامی فلاحی مستقبل کی طرف پیش قدمی کر سکتے ہیں۔ اصلاح اور بہتری کی گنجایش بلاشبہہ موجود ہے۔ جس طرح ماضی میں کی جانے والی کئی دستوری ترامیم نے دستور کو زیادہ بہتر دستاویز بنایا ہے، اسی طرح آیندہ بھی ترمیم کا دروازہ کھلا ہے لیکن ترمیم کا مقصد دستور کو ’قراردادِ مقاصد‘ میں دیے ہوئے مقصد اور وژن سے قریب تر کرنا ہو، اس کی ہیئت کو تبدیل کرنے اور حلیہ بگاڑنے کا معاملہ نہ ہو۔

’قراردادِ مقاصد‘ اور دستور کے اصل محافظ عوام اور تمام دستوری ادارے ہیں۔ ذمہ داری کے مناصب پر فائز ہر فرد، صدرِ مملکت سے لے کر قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ارکان تک، اور ہر سطح کے عدلیہ کے جج صاحبان سے لے کر فوج اور انتظامیہ کے ذمہ داران تک، ہر کسی کا فرض ہے کہ وہ اسلام اور دستور سے وفاداری کے عہد کو in letter and spirit (الفاظ اور روح کے مطابق) پورا کرے۔ یہ عہد ہی ہماری منزل اور ہماری ذمہ داری کو متعین کر دیتا ہے۔

یہاں پاکستان کے ہر شہری کو خود سے سوال کرنا چاہیے کہ کیا ہم اس عہد کے تقاضے پورے کر رہے ہیں؟